R. N. 2186/57 Regd. No.A. 922

انجمن ترقی اردو ہند کا ہفتہ وار اخبار

ہماری زبان

Telephone No. 29

Telegrams: "ANJUMAN"

قیمت
سالانہ تین روپیہ
ایک پرچہ
دس نئے پیسے
تاریخ اشاعت
۱، ۸، ۱۵، ۲۲

جلد ۲۰ - شمارہ ۴۵ | ایڈیٹر - آل احمد سرور | علی گڑھ - ۸ دسمبر ۱۹۶۱ء

سید مجیب الرحمن

جمالیات کی مادّی بنیاد اور اس کا مقصد

فلسفہ کا کام نہ صرف زندگی کے عقائد کو جانچنا ہے بلکہ اس کے ذمے تہذیب کی مقرر کردہ بنیادوں کو بھی پرکھنا ہے۔ اس لئے تہذیب کی ترقی کے لئے فلسفہ کی ترقی نہایت ضروری ہے۔ مگر آج فلسفہ اور بنیادی علوم سے ہماری تہذیب کتراتی نظر آتی ہے۔

آج راکٹ کے دور میں نظریاتی وضاحت جتنی ضروری ہو گئی ہے ویسا پہلے تاریخ میں کبھی نہیں محسوس ہوا۔ مگر اس صدی کے دانشور اس کے برخلاف بنیادی علوم کے معاملے میں دامن بچانے کا رویہ اختیار کئے ہوئے ہیں۔ جبھی تو جہاں ادب اور آرٹ کے مارکٹ میں گھٹیا غیر سنجیدہ اور رجعت پسند ادب اور فن پاروں کی بھرمار ہے وہیں بنیادی مسائل پر ایک غیر فطری خاموشی چھائی ہوئی ہے۔

فلسفۂ جمالیات بھی ان بیچارے علوم میں سے ایک ہے جس کے ذمے ادب اور آرٹ میں جمالیاتی حقیقت کی پرکھ اور کائنات سے ہمارے تعلق کے بارے میں رہبری کرنے کا کام سپرد ہے۔ مگر اس پر برسوں میں کچھ نہیں لکھا جاتا۔ نتیجتاً صورت حال یہ ہے کہ ادب اور آرٹ کے طالب علموں کے لئے استعداد اور وجدان کی بنیاد پر جہاں اچھا شعر کہنا آسان ہے وہیں عروض جاننا مشکل ہے۔ اسی طرح ان کے لئے اچھے جمالیاتی پیکر پیش کرنا آسان معلوم ہوتا ہے مگر جمالیاتی علم کی بنیاد جاننا بہت مشکل ہے کیونکہ اس فلسفہ پر جو کچھ بھی مواد پیش کیا جاتا ہے وہ اتنا مبہم، طولانی اور مشکل پسند ہوتا ہے کہ عام انسان کی سمجھ اسے نہیں پا سکتی۔

آج کل جمالیات کے "ہیگلی" نقطۂ نظر کے دانشوراں پال سارترے کی پیروی میں اس علم کو اس طرح پیش کرنے کی روایت چل پڑی ہے کہ اس سے خود جمال کی حقیقت کو جانچنے کے لئے دشواریاں پیدا ہوتی ہیں۔

گو یہی آغاز ہیگل سے بہت پہلے افلاطون ہی کر گیا۔ مگر تمام فلسفے جیسے جیسے ترقی کرتے گئے مادیت اور سائنٹفک فلسفہ کا روپ اختیار کیا، جمالیات کے فلسفے نے ویسی ترقی نہیں کی، اور وہ تصوریت ہی کے دامن میں پھنسا رہا۔ یہ صحیح ہے کہ ماضی کے اس تصور سے ہمیں مستقبل کی روشنی بھی ملتی ہے۔ سقراط کے تصور میں ہر چیز حسن کی اہمیت کی شکل میں ملتی ہے۔ وہ پوچھتا ہے "حسین چیز سے کیا کوئی مدد ملتی ہے"۔ افلاطون نے فنون لطیفہ کو حکمت و فلسفہ کے مقابلے میں تیسرے درجے کی نقالی کا نام دیا۔ اپیقورس نے روح کو بھی جسم کی طرح مادی مانا اور اس کی آسودگی کو اہمیت دی۔ سینٹ آگسٹین کے ہاں سادگی کو ساخت حسن کا مقصد ہے اور حسن نام ہے توازن اور تناسب کا۔ ٹامس ایکوائنس حسن اور حقیقت کو ایک ہی چیز کے دو نام سمجھتا ہے۔ وائیکو کہتا ہے کہ پہلے ہم محسوس کرتے ہیں، پھر ہم کو مشاہدہ ہوتا ہے اور اس کے بعد ہم عقل سے کام لے کر قیاس و فکر کرتے ہیں۔ لیسنگ حسن سے حسن مادی یا حسن صوری مراد لیتا ہے۔ کانٹ کہتا ہے کہ عقل اور ارادہ کے بیچ میں جمالی حس ایک کڑی کا کام کرتی ہے اور یہ کہ فنون لطیفہ کا کام محض حسین چیزوں کو پیش کرنا نہیں ہے بلکہ چیزوں کو حسین پیرایہ میں پیش کرنا ہے۔ شیلنگ نے کانٹ کی داخلی تصوریت سے اختلاف کیا اور بتایا کہ حسن محض ذہن کی پیداوار نہیں ہے بلکہ نظام قدرت میں موجود ہے۔ حسن نام ہے زندگی کا (مگر یہ زندگی مادی نہیں بلکہ ایک غیر مادی کیفیت ہوتی ہے)

مگر آج سارترے کہتا ہے کہ حقیقی شے جو فطرت میں ملتی ہے حسین نہیں ہو سکتی۔ حسن ایک ایسی قدر ہے جو تخیل سے ہی وابستہ ہو سکتی ہے اور موجود دنیا کی بنیادی ساخت کی نفی سے ہی پیدا ہو سکتی ہے۔ تخیل کے لئے شعور کو حقیقی دنیا سے آزاد ہونے کی ضرورت ہے وغیرہ۔

اور ہیگل نے تو اس خیال کو باضابطہ ایک تصوری فلسفہ کی شکل میں پیش کیا ہے۔ اس کے نقطۂ نظر کے مطابق کائنات زندگی ایک مطلق

تصور کی تکمیل کا عکس ہے اور انسانی روح مظاہر اور مظاہر کے تصور میں یکسانی دیکھنے کی صلاحیت رکھتی ہے اور پھر ساتھ ہی مطلق تصور سے بھی اسے ہم آہنگ بنا کر دیکھتی ہے۔ ذہن کی اس نظر میں ہی دراصل حسن پوشیدہ ہے۔ کیونکہ فطرت جو اس خیال کے مطابق حقیقت کا گھٹیا درجہ کا نمونہ ہے، اصل حقیقت (یعنی تصور) کی آئینہ داری کرتی ہے اور اس لئے مادہ سے روح کو پالینے کے لئے واہمہ کا عمل حسن کہلاتا ہے۔ گویا کوئی شئے از خود حسین نہیں ہے بلکہ واہمہ کی پیداوار ہے اس پوری بات کو اس طرح سے بھی پیش کیا جاسکتا ہے کہ مادہ اور روح کے فرق کو پاٹنے کا کام حسن سے پورا ہوتا ہے۔ مگر چونکہ اس خیال کے مطابق اصل حقیقت روح یا تصور ہے اس لئے ہر شئے جدلیاتی اعتبار سے ترقی کرتے کرتے روح یعنی حقیقت سے قریب ہوتی جاتی ہے اور اس لئے جیسے جیسے انسانی تصور ترقی کرتا جاتا ہے ویسے ویسے حسن کا خاتمہ ہوتا جاتا ہے اور آخر کار صرف حقیقت ہی باقی رہ جاتی ہے۔ ہیگلی جمالیات اس طرح اپنی آپ جڑیں کاٹتی ہیں۔ کیونکہ عملی زندگی میں ہم جانتے ہیں کہ انسانی شعور کی ترقی کے ساتھ انسان کا جمالیاتی احساس گھٹتا نہیں بلکہ بڑھتا ہے۔

پہلے ذرا ہیگلی جمالیات میں "حسین" کی تعریف کا جائزہ بھی لے لیں۔ ہیگل (Friedrich Hegel 1770-1831) کے خیال کے مطابق شئے اور تصور میں مطابقت کا نام حسن ہے۔ گویا وہی شئے حسین ہوتی ہے جو اپنی نوع کی بہترین ہو۔ یہ تعریف فطرت کی ان ہی اقسام کے لئے درست ہوسکتی ہے جہاں ایک ہی نوع میں کثرت اقسام نہ ہو۔ مثلاً جھاڑ وغیرہ۔ مگر جانور اور خصوصاً انسانوں کے لئے حسن کا کوئی ایک مطلق معیار بھی درست نہیں ہوسکتا۔

فرانسیسی ادب کے انیسویں صدی کے مشہور نقاد تائین (Taine) نے بھی ایسے جمالیاتی مطلق معیار کو قبول کرنے سے انکار کیا ہے۔

اسی طرح انیسویں صدی کے عظیم روسی مفکر این جی چرنیشفسکی (N.G. Chernyshevsky 1828-1889) نے ہیگل کے جمالیاتی فلسفہ کا تجزیہ کرتے ہوئے اس کی پرزور مخالفت کی ہے اور خود جمالیاتی مادی فلسفہ کا ایک ایسا ٹھوس اور سائنٹفک فلسفہ پیش کیا ہے کہ اس کی مخالفت آج تک نہ کی جاسکی۔ چرنیشفسکی کہتا ہے کہ حسن سے انسان کے دل میں جو جذبہ پیدا ہوتا ہے وہ ایک دلکش مسرت کا جذبہ ہے۔ اور ہم دیکھتے ہیں کہ ہم حسن سے بے لوث محبت کرنا پسند کرتے ہیں۔ ہم حسن کی تعریف کرتے ہیں اور اس میں ایک طرح کی مسرت محسوس کرتے ہیں۔ اس سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ حسن میں ضرور کوئی "ایسی شئے" پنہاں ہے جو ہمارے دل سے قربت رکھتی ہے۔ اور یہ شئے ضرور ایسی ہمہ گیر، متنوع اور بے حد عام ہونی چاہیے کیونکہ کائنات میں بے انتہا چیزیں جو ایک دوسرے سے مشابہ نہیں ہیں ہمیں حسین نظر آتی ہیں۔ وہ کہتا ہے کہ ایسی ہمہ گیر شئے جو ہم کو سب سے زیادہ عزیز ہے وہ "زندگی" ہے۔ نہ صرف انسان بلکہ ہر ذی روح شئے موت سے گھبراتی ہے اس لئے جمالیات کی بنیاد زندگی ہی ہے۔ اور زندگی ہی حسن ہے۔

اب کہیں جا کر ہمیں جمالیات کی بنیاد ٹٹولنے میں مدد ملتی ہے۔ اب ہماری سمجھ میں بات آسکتی ہے کہ کیوں مختلف لوگوں کے لئے حسن کا معیار مختلف ہوتا ہے۔ اس نقطۂ نگاہ سے کسانوں کی لڑکی کے مضبوط اور محنتی ہونے، اور اونچے طبقے کی دوشیزہ کے نازک ہونے میں حسن کا معیار متعین ہونے کی بات قابل فہم ہے۔ کسان کے لئے محنت کرنا آسودگی حاصل کرنے کی دلیل ہے تو اونچے طبقے کے فرد کے لئے جسمانی محنت سے بچنا اچھائی کا معیار کہلاتی ہے اس لئے کسان اور اونچے طبقے کے افراد کے حسن کے معیار میں فرق ہے۔ چنانچہ چرنیشفسکی کا فلسفہ جمالیات حسن کے ایسے مطلق معیار کی نفی کرتا ہے۔

ہیگل کی جمالیات کا دوسرا قابل اعتراض پہلو یہ ہے کہ چونکہ فطری حسن اس کے خیال کے مطابق ایک واہمہ کی پیداوار ہے اس لئے تخیل کا تخلیق کردہ حسن زیادہ اعلیٰ ہے اور آرٹ کا کام فطرت کے حسن کی کمی کی تلافی کرنا ہے!

اس کے برخلاف چرنیشفسکی کی دی ہوئی حسن کی تعریف "زندگی ہی حسن ہے" سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ حقیقی اور اعلیٰ حسن وہی ہے جو ہم حقیقی دنیا میں دیکھتے اور پاتے ہیں، اور نہ کہ وہ حسن جو ہم آرٹ کے ذریعے پیدا کرتے ہیں۔

ہیگل اور وشر (Friedrich theodore vischer 1807-1888) کے خیال کے مطابق "سبلائم" (Sub-lime) "وہ شئے ہے جو خیال کو ہیئت پر غالب دکھائے" یا یہ کہ "جو غیر محدود ہو"۔ پہلی تعریف کی مثال کے لئے ایک بیج کو لیجئے جس کے اندر سے پتا نکلتا ہو۔ پتا اپنے خول کو توڑ کر نکلتا ہے اور اس طرح شئے ہیئت پر غالب آتی نظر آتی ہے مگر اس کے باوجود یہ کوئی جمیل اور سبلائم (Sub-lime) نظارہ نہیں پیش کرتا۔ دوسری تعریف کے لئے سمندر کی مثال موزوں ہے۔ سب ہی جانتے ہیں کہ غیر محدود سمندر کے مقابلے میں ساحل کو پس منظر میں دکھاتا ہوا محدود سمندر زیادہ حسین معلوم ہوتا ہے۔ پھر غیر محدود شئے حسین کیونکر معلوم ہوسکتی ہے؟

چرنیشفسکی نے سبلائم Sub-lime کی تعریف یوں پیش کی ہے کہ سبلائم وہ شئے ہے جو اس شئے سے بہت زیادہ عظیم تر معلوم ہو جس سے اس کا مقابلہ کیا جائے۔

اب ایک نظر ہیگل کے اس نقطۂ نظر کا بھی جائزہ لیا جائے جس کی رو سے وہ حقیقی حسن کو حقارت سے دیکھتا ہے۔ اور ادب کے تخلیق کردہ حسن کو مثالی حسن تصور کرتا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ فطرت میں جو حسن نظر آتا ہے وہ سوچے سمجھے منصوبہ کا نتیجہ نہیں ہے، اس لئے مکمل نہیں ہے۔ ایسا حسن عارضی ہے، غیر مستقل ہے، اور مطلق نہیں ہے بلکہ انفرادی ہے۔ وغیرہ

اس کے برخلاف واقعہ تو یہ ہے کہ ہر جاندار شئے میں حسن کا احساس پایا جاتا ہے اور جانور تک اپنی شکل کو حسین رکھنے کا احساس رکھتے ہیں۔ اگر حسن زندگی کے بھرپور ہونے کا نام ہے (باقی صفحہ ۱۱ پر)

اداریہ

ادبی مسائل

(۲)

اپنے دور اور اپنی شخصیتوں سے دلچسپی فطری ہے۔ ہم اُن لوگوں میں سے نہیں جو صرف آثار، عجائب خانوں، تاریخ کے دریچوں کے پرستار ہوں۔ اپنے دور کے میلانات سے آگہی، حال کے پیچ و خم، زمانے کی تلاش، گرد و پیش کا احساس اور عرفان ضروری ہے، مگر حال کو بھی ایک معیار، ایک نظر، ایک سلسلے کے تحت دیکھنا چاہیے۔ حال کے گزرتے ہوئے لمحات میں ماضی کے کتنے آڑے ترچھے نقوش ہوتے ہیں اور یہ گزرتے ہوئے لمحات وقت کی رفتار کے متعلق کوئی ایسی کہانی سناتے ہیں جس کا آغاز ہم سے بہت پہلے ہو چکا ہے اور جس کا انجام بھی ہمارے بعد تشکیل پائے گا۔ مطلب یہ ہے کہ حال کا شعور ضروری ہے مگر حال میں گرفتار ہونا غلط۔ اپنے زمانے کی ہر کروٹ اور اپنے دل کی ہر دھڑکن کا شمار کرنا چاہیے، مگر اس کو کائنات کا تنگیت نہ سمجھنا چاہیے۔ ادبی ذوق کے معنی یہ ہیں کہ انسان کو آدمی، سماج اور تہذیب کے ارتقا کا احساس ہو اور ہر آئینے کے سامنے دوسرا آئینہ رکھ سکے۔ اس کے پاس ایسے پیمانے ہوں جو انسانیت کی مجموعی بصیرت کے پیمانے ہیں۔ آج کے ادیبوں کا وقتی اور ہنگامی چیزوں سے متاثر ہونا درست ہے۔ خلا میں پرواز سے کیا کیا امکانات روشن ہوئے ہیں، اس پر غور کرنا چاہیے مگر انسان کہاں سے کہاں پہنچا ہے یہ بھی سمجھنا چاہیے اور غلاظت انسان کو ابھی دھرتی پر سیدھے سبھاؤ چلنے کے لئے کتنے پاپڑ بیلنے ہیں اور کتنے ہفت خواں طے کرنے ہیں، یہ بھی جاننا چاہیے۔ مسئلہ تم کے طاقت بننے کا نہیں، اس طاقت کے رحمت بننے کا ہے اس لئے طاقت کو کس طرح ماضی میں لعنت بنایا گیا ہے اور کس طرح خیر و برکت، یہ بھی جاننا ضروری ہے۔ اسی لئے حال کے ساتھ ماضی کا شعور ایک جامع نظر پیدا کرتا ہے اور مستقبل کی ذمے داریوں سے عہدہ برآ ہونے میں مدد دیتا ہے۔ اگر آج ہماری بساط پر کچھ فتنوں کی جلوہ گری ہے تو ان فتنوں کو کون و فساد کے قواعد کی روشنی میں دیکھنا پڑے گا۔ تبھی ان کے اندر نیا پہلو اور اس نئے چمن میں پرانا رنگ نظر آئے گا۔

پھر ہمیں اپنے دور کے اشخاص سے بھی دلچسپی کم کرنا پڑے گی اور اُن کے کارناموں پر زیادہ دھیان دینا پڑے گا۔ آجکل شخصیت نمبروں کی بھرمار ہے، نہ مردے محفوظ ہیں نہ زندے۔ ہر ایک کی تفصیلات پر چلتی ہوئی تحریریں، ہر ایک کی شخصیت کا ایک بُت بنانے کی پیہم کوششیں، ہر فرد میں انفرادیت اور ہر شخص کو شخصیت دیکھنے کی آرزو، خطوط میں ادب العالیہ کے نمونے، نظریں، اشارے میں تخلیق کے شاہکار آج کل برابر پیش کئے جا رہے ہیں، ایک طرف ہیرو پرستی بڑھ رہی ہے، دوسری طرف جذباتیت پرورش پاتی ہے ہر مرنے والا افلاطون و ارسطو ہے اور ہر زندہ والمیک اور فردوسی۔ یوں ان میں سے کوئی چیز بری نہیں، مگر ان چیزوں کی کثرت ظاہر کرتی ہے کہ پڑھنے والے سنجیدہ علمی ذوق نہیں رکھتے۔ کسی نہ کسی قسم کا مسالہ، نشہ، مزا یا لطف ڈھونڈھتے ہیں۔ یہ ضروری نہیں کہ ہم شاہیر کی پرستش کے جنون میں اپنے فنکاروں کو نظر انداز کر دیں، مگر کس نے کہا ہے کہ شخصیت کے گرد گھومتے رہو، اصلی کتاب نہ پڑھو، اس کے فکر و فن کو نہ دیکھو، اس کی فنی بصیرت میں سے حصہ نہ پاؤ، اس کے تجربے سے اپنے تجربے میں گیرائی حاصل نہ کرو۔ ادب کی ترقی ادیبوں کے نگار خانے سجانے سے نہیں ہوگی، اُن کے خونِ جگر کی آب و تاب کو سمجھنے اور اس سے اپنی نظر میں وسعت اور جامعیت پیدا کرنے سے ہوگی۔ ہاں اگر صرف ادب کو دل بہلانے کے لئے پڑھنا ہے اور اس سے کچھ حاصل کرنا نہیں ہے تو بات دوسری ہے۔

اِدھر اُدھر سے

مغربی جرمنی میں بچوں کے اخبار

معلوم ہوا ہے کہ مغربی جرمنی میں سانڈری اسکولوں کے طلبا اپنے اخبارات اور رسائل شایع کرتے ہیں ان کی تعداد ... ہے یعنی ہر تیسرے اسکول کا اپنا الگ اخبار ہے حالانکہ دس سال پہلے ان اخبارات اور رسائل کی تعداد ایک تھی گزشتہ چند سالوں کے دوران ریڈیو ٹیلی ویژن اور دوسرے اخبارات کی تعداد میں اتنا اضافہ نہیں ہوا جتنا اسکولوں کے طلبہ کے اخبارات میں ہوا ہے۔ یہ اخبار ہر ہفتہ یا دو ہفتہ کے بعد چھپتے ہیں ان میں ایسے مضامین چھپتے ہیں جو طلبہ، اساتذہ اور طلبہ کے والدین کی دلچسپی کے ہوتے ہیں۔ حال ہی میں کچھ اخبار والوں نے مقامی اور بین الاقوامی معاملات کے بارے میں ایسی خبریں چھاپنا شروع کر دی ہیں جو اسکول کے طلبہ کے لئے دلچسپ ہو سکتی ہیں۔ ان اخباروں کے عملہ میں کوئی دس ہزار طلبہ کام کرتے ہیں جو ایڈیٹر، رپورٹر، نامہ نگاروں اور دوسرے عہدوں پر مامور ہیں۔

ٹیگور لائبریری کا قیام

لکھنؤ۔ ۲۳ ر نومبر۔ ٹیگور کے صد سالہ یوم پیدائش منانے والی ریاستی کمیٹی نے طے کیا ہے کہ مرکز اطلاعات حضرت گنج لکھنؤ میں ایک ٹیگور لائبریری قائم کی جائے جس میں رابندر ناتھ ٹیگور کی تصنیف، ان کی بنائی ہوئی تصویریں اور ان سے متعلق تمام اہم تصانیف کو یکجا کیا جائے گا۔ ریاستی حکومت اس کے لئے دس ہزار روپیہ خرچ کرے گی۔

شا کا ڈرامہ نئے حروف تہجی میں

معلوم ہوا ہے کہ برطانیہ کے مشہور تمثیل نگار جارج برنارڈ شا کا ڈرامہ "اینڈرو کلیز اینڈ دی لائن" ۱۹۶۲ء کے اوائل میں انگریزی کے نئے حروف تہجی میں طبع ہو کر بازار میں فروخت ہونے لگے گا۔

دسمبر ۱۹۵۹ء میں یہ معلوم ہوا تھا کہ برطانیہ کے پبلک ٹرسٹی نے برطانیہ کے بین الاقوامی شہرت کے مالک جارج برنارڈ شا کی خواہش کے مطابق انگریزی کے نئے حروف تہجی کی دریافت کا پانچسو اسٹرلنگ کا انعام دینے کے لئے چار اشخاص کا انتخاب کیا تھا۔

پتہ چلا ہے کہ پبلک ٹرسٹی نے جو برنارڈ شا کی خواہش کی تکمیل کے لئے کوشاں ہے حروف تہجی کا نمونہ تیار کرنے والے اور کتاب کے چھاپنے والے کے ناموں کو راز میں رکھا ہے اور ابھی تک کسی پر ظاہر نہیں کیا۔

لارنس کے ناول کی دو سو لاکھ جلدیں سال بھر میں فروخت ہوئیں

"پنگوین بک" فرم نے ڈی۔ ایچ لارنس کی لکھی ہوئی کتاب "لیڈی چیٹرلیز لور" کی دو سو لاکھ جلدیں سال بھر میں فروخت کر دی ہیں۔ ایک جلد کی قیمت ۳ شلنگ ۶ پنس تھی۔ اس کتاب کے سلسلے میں ایک مقدمہ کچھ عرصے تک عدالت میں زیر سماعت رہا۔ اس کی وجہ سے اس کتاب کی کافی شہرت ہو گئی۔ برطانیہ کے مشہور ادیبوں نے اس کتاب کے حق میں رائے دی۔ اس وقت بھی یہ کتاب (۱۰۰۰۰) دس ہزار ماہانہ کے حساب سے فروخت ہو رہی ہے۔ یہ فرم اب تک صرف اس کتاب سے ۸ لاکھ پونڈ کما چکی ہے اور اس کی ۸۰ ہزار پونڈ رائلٹی لارنس کے لواحقین کو مل چکی ہے۔ "پنگوائن بک" کے مینیجنگ ڈائرکٹر سر ایلن لین نے بتایا ہے کہ اس کتاب کی شہرت عام کتابوں سے بہت زیادہ ہو چکی ہے۔

"پنگوائن بک" فرم نے "لیڈی چیٹرلیز لور" کے مقدمہ کا حال بھی ایک کتاب کی صورت میں چھاپا ہے اور اس سے بھی رقم کمائی ہے۔

ریاستی آرٹ نمائش

حکومت مہاراشٹر نے فیصلہ کیا ہے کہ آئندہ جنوری میں بمبئی میں ساتویں سالانہ ریاستی آرٹ نمائش منعقد کی جائے۔

یہ نمائش جو ثقافتی سرگرمیوں کا جز ہے ریاست مہاراشٹر کے فنکاروں اور دستکاروں کے کام کی حد تک محدود اور حسب ذیل درجوں پر منقسم ہے:-

(۱) فنکاروں کا کام (۲) آرٹ کے طلبہ کا کام (۳) آٹھویں جماعت اور اس سے اوپر کی جماعتوں کے طلبائے مدارس کا کام اور (۴) ساتویں جماعت تک کے اسکولوں کے طلبہ کا کام۔

فنکاروں اور آرٹ کے طلبہ کا کام مختلف موضوعات جیسے ڈرائنگ اور پینٹنگ، مجسمہ، آرٹ اور دستکاری، فن تعمیر، کمرشیل آرٹ، فوٹو گرافی وغیرہ پر منقسم ہو گا۔

جرمن کتابی میلہ میں ہندوستان کی شرکت

فرینکفورٹ۔ اس سال کے تیرھویں فرینکفورٹ کے بین الاقوامی میلہ برائے کتب کی سب سے بڑی کشش ہندوستانی نائب صدر جناب ڈاکٹر رادھا کرشنن کو دیا جانے والا انعام تھا۔ ڈھائی ہزار ڈالر کی مالیت کا یہ انعام ادب و فنون لطیفہ کی خدمت کے لئے وقف ہے۔ جس کے ذریعہ عوام کی ادب دوستی کے جذبات کو برقرار رکھا جاتا ہے۔ اس کتابی نمائش میں ۳۲ ممالک کے ۱۸۸۲ ناشرین نے ساٹھ ہزار کتابی نسخہ جات کے ساتھ شرکت کی جن میں ہندوستان کی باقاعدہ نمائندگی اس بار غیر معمولی طور پر موثر اور جاذب نظر تھی۔ انگریزی میں ہندوستانی ادب و ثقافت پر ایک وسیع انتخاب کے ساتھ ہندوستانی مصنفین کی جرمنی زبان میں ترجمہ شدہ کتب کی نمائش خاص طور پر لائق توجہ تھی۔ رابندر ناتھ ٹیگور کی مختلف تصانیف کے علاوہ ہندوستانی وزیر اعظم پنڈت جواہر لال نہرو اور کرشنا مورتی کی جرمن ترجمہ شدہ کتب غیر معمولی طور پر جرمن ادبی حلقوں کی دلچسپی کا باعث بنیں۔ اگرچہ گزشتہ ۱۹۶۰ء میں روسی مصنف بورس پیسٹرناک کی تصانیف "ڈاکٹر ژواگو" کی طرح کوئی کتاب بھی بین الاقوامی مقبولیت حاصل نہ کر سکی۔ تاہم یونیسکو کے تجزیات اور شائع کردہ اعداد و شمار کے مطابق متعدد کتب عالمی دلچسپی اور مقبولیت سے نوازی گئیں۔

جہاں تک نئی اشاعت کا تعلق ہے سال رواں میں دس ہزار سے زائد کتب شائع کرنے والے ممالک میں روس، جاپان، برطانیہ، وفاقی جمہوریہ امریکہ، فرانس، ہندوستان اور اٹلی کے نام آتے ہیں۔

چھ روز کے اندر نمائش کے دیکھنے والے تماشائیوں کی تعداد ۶۰ ہزار سے کسی صورت میں بھی کم نہ تھی۔ نمائش گاہ کے عین وسط میں ۱۹۶۰ء کی بہترین کتب کی علیحدہ نمائش خاص طور پر دیکھنے والوں کے لئے باعث کشش ثابت ہوئی۔ یہاں پر محض ایسی کتابیں پیش کی گئیں جو کسی نہ کسی خصوصیت کے باعث امتیازی حیثیت کی مالک تھیں۔ اس مجموعہ میں کتب کے علاوہ رسائل کو بھی خاص جگہ حاصل تھی۔

جنوبی ہند کی زبان سیکھنے کے لئے انعام

نئی دہلی۔ ۲۹ر نومبر۔ مرکزی وزیر داخلہ نے ایک انعام کا اعلان کیا ہے جو انڈین پولس سروس) کے اس زیر تربیت امیدوار کو دیا جائے گا جو جنوبی ہند کی چار زبانوں۔ تامل، تیلگو، ملیالم اور کنڑی میں سے کوئی ایک زبان سیکھنے میں دوسروں پر سبقت لے جائے گا۔

یہ انعام صرف ان ہندوستانی کیڈٹوں کو دیا جائے گا جو جنوبی ہند کے باشندے نہیں ہیں۔ انعام ہر سال پاسنگ آؤٹ پریڈ کے موقع پر دیا جائے گا۔ انعام کا مقصد جنوبی ہند کی زبانیں سیکھنے کا اشتیاق پیدا کرنا ہے۔

اسی طرح ہر سال ایک انعام اس کیڈٹ کو بھی دیا جائے گا جو اس علاقہ کا باشندہ ہو جس میں ہندی بولی جاتی ہے مگر اس کے باوجود اس نے ہندی میں مطلوبہ قابلیت حاصل کر لی ہے۔

غروب

منیب الرحمٰن

جب آخری کرنیں
سورج سے بچھڑ کر
پھرتی تھیں ہراساں
دامانِ افق پر
میں نے اسے دیکھا
ہاتھوں نے صدا دی
اے آخری کرنو
تم جاؤ گھڑی بھر

ناگاہ اندھیرا
ہر سمت سے جھپٹا
سنسان تھیں راہیں
اک نالۂ شب گیر
اٹھتا تھا فضا میں
ہر گام پہ حائل
پہنائی صحرا
ہر سانس تجسس
ہر اشک، تمنا

"شام کا منظر"

محمد علوی

روز شام آتی ہے
روز ڈوبتا سورج
ڈوبنے سے کچھ پہلے
ننھی منی کرنوں کو
پیار سے بلاتا ہے
اور ڈوب جاتا ہے!

ایک پھول

عادل منصوری

صحرا میں اک پھول کھلا ہے
ذرہ ذرہ ناچ اٹھا ہے
دور دیس سے پنچھی آیا
اُس نے ملن کا گیت سنایا
بادِ صبا جھومی اٹھلائی
خوشبو سے دامن بھر لائی
شبنم نے موتی برسائے
اور دھنک نے رنگ لٹائے
بجلی پردہ چھوڑ کے آئی
بارش بندھن توڑ کے آئی
ذرہ ذرہ ناچ اٹھا ہے
صحرا میں اک پھول کھلا ہے

غزل

شہاب سروری

بہار ختمِ خزاں کا ظہور بھی تو نہیں
ہر ایک پھول کھلے یہ ضرور بھی تو نہیں

جو کچھ کرے وہ کیے کی سزا جزا پائے
مگر جو کچھ نہ کرے بے قصور بھی تو نہیں

لگی ہے آگ مگر آگ کی لگی جانے
کسی کلیم کو اتنا شعور بھی تو نہیں

مزاجِ حسن سے یوں اور دکھ پہنچتا ہے
جیسے غرور کہیں وہ غرور بھی تو نہیں

شراب وہ نہ رہی یا ہمیں نہ راس آئی
نشے کی چھوڑئیے ہلکا سرور بھی تو نہیں

گلِ چمن کی اُداسی کا بھید کیا جانے
ابھی غریب کی آنکھوں میں نور بھی تو نہیں

وہ بات اور ہے منزل قریب آ نہ سکی
یہ بات اپنی جگہ ہے کہ دور بھی تو نہیں

غزل

ناصر شہزاد

دستار اچھالے گرے پیڑ سے پھل کر
کون آیا مرے پاس کڑی دھوپ میں چل کر

لہرا گئی رستوں پہ مہک تیرے بدن کی
کل باغ سے جب آئی ہوا پھول مسل کر

کنگن بجے خوشبوئیں اُڑیں گاگریں چھلکیں
پنگھٹ کو چلیں گوریاں گاؤں سے نکل کر

اک یاد سلگتی ہے مرے دل کے کھنڈر میں
اک درد مہکتا ہے مری روح میں ڈھل کر

دن، شام، تری سوچ، سفر، بھاگتی گاڑی
بکھری ہے درختوں پہ شفق مہندیاں مل کر

راکھ اڑتی ہے آشاؤں کے پنڈال میں ناصر
دل بجھ گیا چاہت کی مہا آگ میں جل کر

غزل

پیر مراتب اختر

جو زندگی کے محرمِ اسرار ہو گئے
وہ وجہِ زینتِ رسن و دار ہو گئے

آیا نہ ایک پل کے لئے کوئی بام پر
ہم تھے کہ سایۂ در و دیوار ہو گئے

جب بھی ہمارا ذکر ہوا اس کے سامنے
رخسار اس کے شرم سے گلنار ہو گئے

کل یوں تمہاری یاد کی خوشبو بھری رُتیں
گذریں کہ دل کے دشت بھی گلزار ہو گئے

اک پیکرِ جمیل کو دیکھا تڑپ گئے
اک روگ دل کو لگ گیا بیمار ہو گئے

اختر ہمارے شعر غم و درد و یاس کے
سانچوں میں ڈھل کے نکلے تو شہکار ہو گئے

مراسلات

سرودِ رفتہ یعنی علامہ اقبالؒ کا وہ کلام جو ان کے ترتیب دیئے ہوئے کسی مجموعے میں شامل نہ ہوا اور اب علامہ کی وفات کے بعد مولوی غلام رسول مہر اور مولوی صادق علی دلاوری نے ترتیب دے کر اپنے تحشیہ کے ساتھ کتاب منزل لاہور سے بار اول ۱۹۵۹ء میں شائع کیا ہے۔

دورانِ مطالعہ کتاب مذکور میں جو چند اغلاط ملے ہیں اصلاح کے خیال سے درج ذیل ہیں:-

(۱) ص ۲۰-۱۹-۱۸ یتیم کا خطاب ہلالِ عید سے

بند سوم ص ۲۰ :- اس بند کا تیسرا شعر ؎

خامشی سوز ہے نظارہ ترا ● غازۂ عارضِ مقال ہے تو

مرتبین نے حذف کر دیا ہے درج ہونا چاہیئے۔

(۲) ص ۴۲ - ابرِ گہر بار

اس نظم کے پہلے بند کا پہلا شعر ؎

دل میں جو کچھ ہے زباں پر اسے لاؤں کیونکر
ہے چھپانے کی نہ جو بات چھپاؤں کیونکر

بے معنی ہو کر رہ گیا ہے۔ اصل میں پہلا مصرع اس طرح پر ہے:

ع - دل میں جو کچھ ہے نہ لب پر اسے لاؤں کیونکر

(۳) ص ۵۲ - برگِ گل

اس نظم کے پہلے بند کا نواں شعر (ص ۵۳) ؎

کس قدر سرسبز ہے صحرا محبت کا تری
اشک کی نہریں ہیں اور سائے ہیں نخل آہ کے

اور دوسرے بند (ص ۵۴) کا آخری شعر ؎

ہاں قسم دیتا ہوں میں مدفونِ یثرب کی تجھے
کر دعا حق سے کہ میں چھٹ جاؤں اس آزار سے

اور تیسرے بند (ص ۵۴) کا تیسرا شعر ؎

آہ اس غم میں اگر تو نے خبر میری نہ لی ● غرق کر ڈالے گی آخر کو یہ چشمِ تر مجھے

معلوم نہیں مرتبین نے کیوں حذف کر دیا ہے۔

(۴) ص ۶۳ - جوہرِ انسان

اس نظم کے پانچویں شعر ؎ ذرے ذرے کا بنا دستِ صحرا کا امیں کا دوسرا مصرع۔ جوشِ توحید سے ہر قطرے کو طوفاں کر دے کاتب نے کتابت میں چھوڑ دیا ہے۔

ص ۱۰۹-۱۰۸ - شمع

اس نظم کے حذف شدہ اشعار میں مندرجہ ذیل شعر کا بھی شمار ہے جس کو مرتبین نے درج نہیں کیا ہے۔ اس شعر کو حذف شدہ اشعار مندرجہ کتاب کے آخری شعر سے پہلے درج ہونا چاہیئے۔ ؎

ہمدوا کہ وہم غیر میں ہوں میں پھنسا ہوا
آذر خلیل ہے بُت پندار کا ہوا

ص ۱۱۴-۱۱۶-۱۱۵ - تصویرِ درد

اس نظم کے تیسرے حذف شدہ بند کا ٹیپ کا شعر ؎

بُرا ہوں یا بھلا ہوں میرا کہنا سب کو بھاتا ہے
وہی کہتا ہوں جو کچھ سامنے آنکھوں کے آتا ہے

مرتبین نے معلوم نہیں کیوں حذف کر دیا ہے۔ درجِ کتاب ہونا چاہیئے

ص ۱۴۳ - غزل

اس غزل کا ایک شعر ؎

نسیمِ صبح نہ چھیڑے مجھے کہ دامن سے
کسی کے ہاتھ کا جھاڑا ہوا غبار ہوں میں

درج ہونے سے رہ گیا ہے۔ درج ہونا چاہیئے۔

(مندرجہ رسالہ بزم سخن گیا۔ ماہ اپریل ۱۹۰۲ء)

ص ۱۴۶-۱۴۷ - غزل

اس مشہور غزل کا ایک شعر ؎

جادو عجب نگاہِ خریدار دل میں تھا
بکتا ہے ساتھ بیچنے والا بھی مال کے

درجِ کتاب ہونے سے رہ گیا ہے۔

ص ۱۹۳ - مرثیہ اکبر الٰہ آبادی

اس فارسی قطعہ کا تیسرا شعر ؎

گہے گریۂ او چو ابرِ بہارے ● گہے خندۂ او چو تیغِ اصیلے

درج نہیں ہوا ہے۔ معلوم نہیں کیوں حذف کر دیا گیا ہے۔

(محمد بشیر الحق دسنوی)

اُردو تلفظ اور تحریر سے متعلق بعض مشورے جب آپ 'افسانہ' سے 'افسانے'، 'پیسہ' سے 'پیسے' اور 'فرشتہ' سے 'فرشتے' نہیں لکھتے تو پھر 'مصرع' سے 'مصرعے' کیوں؟ 'مصرے' کیوں نہیں؟ ہماری زبان میں حرف 'ع' تو حرف الف ہو کر رہ گیا ہے! ہم بولتے تو ہیں मिसरे مگر لکھتے ہیں मिसरअ !

غلط		صحیح
نظریئے		نظریے
ٹائپ		ٹ ا ئ پ
کوئین	(QUEEN)	کُ وٗ ئ ن
فائن	(FINE)	ف ا ئ ن

●

اُردو میں اب تک of ، on ، all ، ball وغیرہ کو آف، آن، آل، بال لکھا جاتا ہے۔ اس طرح انگریزی کا صحیح تلفظ ہمارے یہاں قائم نہیں رہتا۔ (انگریزی داں اہلِ اردو، عام طور سے صحیح انگریزی تلفظ کرتے ہیں) میری یہ حقیر سی تجویز ہے کہ ہم ایک انقلابی لہجے کو اپنا لیں۔

ball - بٗ اَل ؛ call - کٗ اَل ؛ boy - بٗ اَ ے ؛
toy - ٹٗ اَ ے ؛ all - وٗ اَل (ٹال) ؛ off - وٗ اَف -

(اقبال کرشن)

انجمن کا خبر نامہ

پنجاب میں اُردو کے ساتھ ناروا سلوک

انبالہ ۲۹ر نومبر۔ انجمن ترقی اُردو شاخ پنجاب کے نائب صدر جناب ٹھاکر سنگھ اور جنرل سکریٹری اوم پرکاش ملک نے ایک مشترکہ بیان دیتے ہوئے کہا کہ انجمن مرکزی حکومت ہند کے مقرر کردہ اس کمیشن کے سامنے اُردو کا مسئلہ پیش کرنے کا ارادہ رکھتی ہے۔ انجمن کمیشن کے صدر کو اُردو کا مسئلہ پیش کرنے کی اجازت حاصل کرنے کے لئے خط بھی لکھ چکی ہے۔

بیان میں کہا گیا ہے کہ انجمن کمیشن کے سامنے دلائل اور اعداد و شمار سے ثابت کرے گی کہ پنجاب میں سکھوں اور ہندوؤں کے ساتھ کسی قسم کا فرق نہیں برتا جاتا۔ اگر کسی کے ساتھ فرق برتا جاتا ہے تو وہ اُردو زبان اور اردو بولنے والے عوام ہیں انجمن اپنا یہ موقف اس دلیل کے ساتھ پیش کرے گی کہ پنجاب میں تمام فرقہ وارانہ اور لسانی کشمکش اور اختلافات اس وجہ سے ہیں کہ یہاں اُردو زبان تمام پنجابیوں کا مشترکہ ورثہ تھی اور ریاست کے مختلف طبقوں کے درمیان تعلق کا ذریعہ تھی اسکو ان مسلمانوں کی زبان سمجھا گیا جو پاکستان چلے گئے اور اس زبان کو دیش نکالا دے دیا گیا۔ پنجاب کا سارا خلفشار اسی کا لازمی نتیجہ ہے۔

(ایک نامہ نگار)

بہار ریاستی انجمن ترقی اُردو بھاگلپور کی دو اہم میٹنگیں

(۱) مورخہ ۱۲ر نومبر ۱۹۶۱ء بروز اتوار بوقت دو بجے دن انجمن ترقی اردو بھاگلپور کے زیر اہتمام شہر کے معزز محبان اردو کی ایک خصوصی نشست ہوئی جس کی صدارت جناب ڈاکٹر محمد یونس صاحب صدر انجمن ترقی اردو موصوف ہی کی صدارت میں ہوئی جس میں شہر کے بہت سارے اردو دوستوں نے شرکت فرمائی اور بالاتفاق حسب ذیل تجویزیں منظور کی گئیں۔

(۱) انجمن ترقی اُردو (شاخ بھاگلپور) کے زیر تحت ایک مرکزی اُردو لائبریری کا قیام از حد ضروری ہے اور صدر اور سکریٹری انجمن ترقی اُردو (شاخ بھاگلپور) کو اختیار دیا جاتا ہے کہ شہر کے اُردو دوستوں میں سے اپنے طور پر پانچ حضرات کا انتخاب کریں

اور حسب ذیل حضرات پر مشتمل لائبریری کی ایک مجلس عاملہ ہو جس کے ذمہ فراہمی چندہ کے علاوہ قیام لائبریری سے متعلق سارا نظم و نسق ہو (۱) ڈاکٹر احمد حسین صاحب (۲) ڈاکٹر عزیز احمد صاحب (۳) ڈاکٹر غلام قادر صاحب (۴) سید شاہ شرف عالم صاحب (۵) منصور احمد خاں صاحب (۶) ڈاکٹر محمد یونس صاحب (۷) ڈاکٹر غیاث احمد صاحب۔

(۲) متفقہ طور پر ایکس حضرات پر مشتمل ایک مجلس عاملہ کی تشکیل ہوئی تاکہ لائبریری کے قیام و انتظام سے متعلق سارے امور پر وقت ضرورت مشورہ لیا جائے۔

(۲) انجمن ترقی اردو (شاخ بھاگلپور) کی ایک نشست ۱۹ر نومبر ۶۱ء بروز اتوار بمقام کرۂ ڈاکٹر محمد یونس صاحب صدر انجمن ترقی اردو موصوف ہی کے زیر صدارت ہوئی جس میں شہر کے محبان اُردو کے علاوہ طلبہ کی کافی تعداد نے شرکت فرمائی۔ اس نشست میں حسب ذیل تجویز باتفاق رائے منظور ہوئی :-

بھاگلپور یونیورسٹی کے طلبہ کو اُردو کی اعلیٰ تعلیم (آنرز اور ایم۔ اے) حاصل کرنے میں جو دقتیں دوسری یونیورسٹیوں میں پیش آرہی ہیں ان کے پیش نظر اس ڈویژن کے بااثر حضرات اور انجمن ترقی اُردو پر مشتمل ایک وفد جناب وائس چانسلر و خازن صاحبان بھاگلپور یونیورسٹی سے مل کر ان کو صورت حال سے آگاہ کریں اور ان سے مطالبہ کریں کہ اس یونیورسٹی میں بھی جلد از جلد اُردو کی اعلیٰ تعلیم کا انتظام کر دیا جائے تاکہ طلبہ مزید پریشانیوں سے بچ جائیں اور امسال کے واسطے کم از کم ان کو اس یونیورسٹی میں امتحان دینے کی اجازت دی جائے۔ (غیاث احمد سکریٹری)

معراج ادب گورکھپور کا جلسہ

انجمن معراج ادب گورکھپور (یو۔ پی) کی مجلس عاملہ کا ایک جلسہ زیر صدارت ضمیر احمد صاحب منعقد ہوا جس میں حسب ذیل امور متفقہ طور پر منظور ہوئے۔

۱۔ لسانی کمیٹی اترپردیش (لینگویج کمیٹی) کے سوالنامے کا جواب جو اگست ۶۱ء کو روانہ کیا گیا منظور ہوا۔

۲۔ تنظیمی امور کے سلسلے میں یہ طے ہوا کہ ممبرسازی ۳۱ر دسمبر ۶۱ء تک کی جائے، اس کے بعد انتخاب کیا جائے، جب تک عارضی کمیٹی کام کرے۔ البتہ محمد یحییٰ خاں صاحب یوسف زئی عاصی اور نسیم احمد سیفی کو جوائنٹ سکریٹری منتخب کیا گیا۔

۳۔ حسب ذیل تجویزیں منظور ہوئیں :-

(الف) انجمن معراج ادب گورکھپور کی مجلس عاملہ کا یہ جلسہ الیکشن کمیشن سے مطالبہ کرتا ہے کہ گورکھپور کے حلقہ کی ووٹران کی فہرست اردو میں بھی شائع کرے کیونکہ ضلع گورکھپور میں اُردو داں طبقہ کی ایک کثیر تعداد آباد ہے۔

(ب) انجمن معراج ادب گورکھپور کی مجلس عاملہ کا یہ جلسہ حکومت اترپردیش کے ٹرانسپورٹ منسٹر سے مطالبہ کرتا ہے کہ روڈویز ٹرانسپورٹ کی سرکاری بسوں پر ایک جگہ سے دوسری جگہ آنے جانے کی تختی اُردو میں بھی لگوائیں تاکہ مسافروں کو دقت نہ ہو۔

(مسٹر یوسف زئی۔ جنرل سکریٹری)

کریم نگر میں "یوم ٹیگور"

انجمن ترقی اُردو شاخ ضلع کریم نگر کی جانب سے بتاریخ ۲۵ر نومبر ۱۹۶۱ء بوقت ۸ ساعت شب بمقام مدرسہ ثانوی فوقانیہ کریم نگر، بصدارت راجہ رام کرن صاحب' ہندوستان کے عظیم شاعر گرودیو ٹیگور کے جشن صد سالہ یوم پیدائش کے سلسلے میں "یوم ٹیگور" منایا گیا جناب اندر سروپ صاحب نے قومی ترانہ پڑھا۔ جناب ابوالمکارم غازی الدین کمال کریم نگری صاحب نے قومی ترانہ کا ترجمہ سنایا اور اس کی تاریخ بیان کی۔

معتمد صاحب انجمن ترقی اُردو نے "یوم ٹیگور" کے موقع پر موصولہ گوپال ریڈی اور نورالحسن جعفری کے پیامات پڑھ کر سنائے۔

سمپوزیم:۔ جناب اندر سروپ صاحب نے "ٹیگور کی عظمت"، جناب ابوالمکارم غازی الدین کمال کریم نگری صاحب نے "ٹیگور کی خدمت میں عقیدت کا ایک پھول"، جناب ایم۔ اے غفار صاحب لکچرار کالج نے "ٹیگور کی شاعری" کے عنوان سے اپنا مقالہ سنایا اور جناب عبدالرشید صاحب درانی نے جناب آل احمد سرور صاحب معتمد مرکزی انجمن ترقی اردو علی گڑھ کا لکھا ہوا مضمون "ٹیگور کی یاد میں" پڑھ کر سنایا۔

صدر جلسہ رام کرن صاحب نے ٹیگور کے بارے میں اپنے خیالات کا اظہار کرتے ہوئے کہا کہ ٹیگور انسانی آزادی و مساوات کے علم بردار ہیں۔ انھوں نے دنیا کے سامنے آزادیٔ فکر و عمل اور باہمی صلح و محبت کا پیغام پیش کیا ہے آج ان کے پیغام پر عمل پیرا ہونے کی ضرورت ہے۔

کلام ٹیگور کا ترجمہ:۔ ٹیگور کی ایک نظم "اے دل" مترجمہ جگن ناتھ آزاد، اور عبدالعزیز خالد کی ترجمہ کی ہوئی گیتا نجلی کی ایک نظم "کل نغمہ"، اندر سروپ صاحب نے گیتانجلی کی ایک اور نظم "نغمۂ فطرت" مترجمہ برق دہلوی' ضمیرالدین صاحب نے اور جناب ستار چشتی صاحب کی نظم "شاعر عالی مقام" عبدالرشید صاحب درانی نے پیش کی۔

مشاعرہ:۔ جمیل حسین ہاشمی کی نظم "خراج عقیدت" سے غیر طرحی مشاعرہ کا آغاز عمل میں آیا جناب فضل اللہ ثاقب، غلام علی ہاشمی، اندر سروپ نثار، عبدالباسط باسط، رحیم الدین کمال' ایم۔ اے۔ غفار، صابر توکلی شاہین نے اپنا کلام سنایا۔ آخر میں قاضی محمد بشیرالدین صاحب نے شفیع الدین نیر کی نظم "ٹیگور" سنائی۔ معتمد صاحب انجمن ترقی اُردو کے شکریہ کے ساتھ "یوم ٹیگور" کے پروگرام کا اختتام عمل میں آیا۔

(ابوالمکارم غازی الدین کمال معتمد شاخ کریم نگر)

"ہماری زبان" میں اشاعت کے لئے مضامین نظم و نثر بھیجتے وقت اس کا خیال رکھئے کہ وہ غیر مطبوعہ اور مختصر ہوں۔ ادارہ

اُردو مجلس کا ادبی اجلاس

اُردو مجلس حیدرآباد کا ماہانہ ادبی اجلاس صدر اردو مجلس رائے جانکی پرشاد کی صدارت میں ۲۶ر نومبر ۱۹۶۱ء کو شام کے سوا پانچ بجے منعقد ہوا۔ جناب سرینواس لاہوٹی نے ہندی کے عظیم شاعر سوریہ کانت ترپاٹھی نرالا کی شاعری اور شخصیت پر ایک مضمون بعنوان "مست مولا" سنایا اور کہا کہ "نرالا ان چند فنکاروں میں سے ایک ہیں جنھوں نے ہمارے ادب کے رُخ کو صحت مند سمت کی طرف موڑا۔ آج سے ۶۵ سال قبل وہ یو۔پی کے ایک برہمن خاندان میں پیدا ہوئے تھے، باغیانہ خیالات رکھنے کی وجہ سے انھیں کم عمری ہی میں گھر بار چھوڑ دینا پڑا تھا۔ نرالا نے قلم کے ذریعہ اپنے پیروں پر کھڑے ہونے کی کامیاب کوشش کی تھی وہ ہندستان کی عظیم روایات کے نہ صرف امین اور پاسباں تھے بلکہ انھوں نے ان روایات کو آگے بھی بڑھایا۔

نرالا صرف شاعر ہی نہیں تھے بلکہ موسیقار، آرٹسٹ، ادیب اور پہلوان بھی تھے اور اپنے مخصوص کردار کی وجہ سے ایک دلچسپ شخصیت کے مالک۔ ان کی خودداری ضرب المثل بن چکی تھی۔

سرینواس لاہوٹی کے مضمون کے بعد محترمہ بانو طاہرہ سعید نے "اردو کی شاعر خواتین" کے زیر عنوان اپنا مقالہ پڑھا۔ انھوں نے خواتین کی اُردو شاعری کو ۱۷۰۰ء سے ۱۹۶۰ء تک چار ادوار میں محاکمہ کرتے ہوئے تفصیلی جائزہ لیا۔

بانو طاہرہ سعید کے مضمون کے بعد مقامی شعراء نے اپنا کلام سنایا۔

جناب محمد منظور احمد صاحب معتمد اعزازی اردو مجلس کے شکریہ پر یہ ادبی اجلاس برخاست ہوا۔

(وقار خلیل)

حامد چھپروی

چکبست بحیثیت نقاد

پنڈت برج نرائن چکبست لکھنوی ایک شاعر کی حیثیت سے ادبی دنیا میں داخل ہوئے مگر ایک تنقید نگار کے بلند مرتبے پر فائز ہو گئے بیسویں صدی کے ابتدائی دور میں جس قدر بھی اُردو زبان میں تنقید نگار جلوہ گر ہوئے ان میں چکبست کا اپنا ایک خاص پایہ ہے۔ اور اس لحاظ سے تو وہ منفرد ہیں کہ انھوں نے اپنے تنقیدی مضامین کے ذریعہ نہ صرف اُردو ادب کو ایک اعلیٰ درجہ کی زبان اور ہندو مسلم اتحاد کا ایک ناقابل تسخیر قلعہ ثابت کیا اور یہ بھی بعنوان شائستہ ظاہر کیا کہ اردو زبان کی جو خدمت ہندو حضرات نے کی وہ بمقابلہ مسلمانوں کے زیادہ قابل فخر ہے بلکہ انھوں نے ہندوستان سے ذاتی تفریق کو بھی مٹا کے اتحاد و یگانگت پیدا کرنے کے لئے تہذیب و معاشرت کو بھی اپنی تنقید نگاری کا عنوان بنا لیا تھا۔ بہ الفاظ دیگر چکبست اردو زبان کے وہ واحد تنقید نگار تھے جو ادب، اردو زبان، ہندوستانی عوام اور انسانیت کو ایک مجموعۂ لاینفک قرار دیتے تھے۔ چکبست نے بالعموم اپنی تنقید کا عنوان ان ہی ہندو شعرا و ادب کو بنایا تھا جو اردو زبان کے معمار اور ستون علم گزرے ہیں۔ اس کی وجہ یہ نہ تھی کہ چونکہ وہ خود ہندو تھے اس لئے ہندوؤں کو سراہنے کی کوشش کی، بلکہ چکبست اس دور کے انسان تھے جب انگریزوں نے اپنی سیاست کو فروغ دینے کے لئے اُردو ہندی اور ہندو مسلم کے سوال کو ہندوستانیوں میں باہم منافرت پیدا کرنے کے لئے اچھال دیا تھا۔ چکبست اس طور پر دکھانا یہ بات چاہتے تھے کہ اردو کا تعلق مسلم طبقہ سے نہیں بلکہ ہندوستان سے ہے اور ہندوؤں نے اس زبان کی جیسی خدمت کی اور اس خدمت میں اپنا خون پانی کیا ہے وہ اس حقیقت پر شاہد ہے کہ یہ زبان سارے ہندوستانیوں کی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ انھوں نے ایک مرتبہ "تاریخ" کے عنوان سے ایک بڑا زوردار مقالہ لکھا تھا جس میں یہ ظاہر کیا تھا کہ تاریخ گواہ ہے کہ موجودہ ہندوستانی اپنے کو مسلمان اور ہندو کہہ کے الگ الگ قوم کہہ ہی نہیں سکتے کیونکہ یہاں کی تہذیب، معاشرت، ادب، کلچر کوئی بھی خالص ہندو ہے نہ مسلم۔ یہ دونوں مسلک مل کر ایک ہو گئے ہیں اور اب کوئی تفریق مشکل ہے۔ نہ صرف اتنا بلکہ انھوں نے اپنے ایک مقالے "ذات کی تفریق" کے ذریعہ نہ صرف ہندوؤں اور مسلمانوں کے جہل و تعصب کو دور کرنے کے لئے بلکہ آئندہ برادرانہ اتحاد کیلئے اس حد تک کہہ گئے تھے کہ ذات کوئی چیز ہی نہیں رہی ہے، لہٰذا ہندوستانیوں کو آپس میں معاشرتی میل جول کو اس حد تک آگے بڑھا دینا چاہئے کہ ہندو مسلم کا تفرقہ ہی ختم ہو جائے اور آپس میں ایسے اٹوٹ رشتے قائم ہو جائیں جن پر ہندوستانی فخر کر سکیں۔ غرض یہ تھا چکبست کا جذبہ۔ اور اسی لئے انھوں نے اگر ایک طرف نسیم لکھنوی کے ادب پر سیر حاصل مقالہ لکھا تو داغ دہلوی کو بھی فراموش نہ کیا۔ اگر رتن ناتھ سرشار کو اپنی تنقید کا عنوان بنایا تو منشی سجاد حسین کو بھی سراہا۔ چکبست کا سب سے گراں قدر مقالہ وہ ہے جو انھوں نے نسیم اور ان کی مثنوی پر لکھا۔ اور ہر چند کہ دراصل نسیم نے مثنوی "گلزار نسیم" میر حسن کی مثنوی "سحر البیان" سے متاثر ہو کر لکھی تھی مگر چکبست نے نہ صرف اس کا اعتراف کیا بلکہ سحر البیان کی جادو بیانی کے اعتراف کے ساتھ ساتھ نسیم کے کمالات کو اجاگر کرنے کی کوشش کی۔ نہ صرف اتنا بلکہ گلزار نسیم کا ایک عالمانہ مقدمہ بھی لکھا اور حقیقت یہ ہے کہ نسیم کو جیسی داد چکبست نے دی ویسی کسی اور اہل قلم سے ان کو نہ ملی۔ چنانچہ جب اس کے خلاف شرر نے کچھ الفاظ رائے ظاہر کی تو چکبست میدان میں آ گئے اور انھوں نے شرر کے ہر ہر اعتراض کا جواب دیا اور مسکت جواب دیا۔ یہ مقالہ اس لحاظ سے بھی قابل دید ہے کہ اس سے چکبست کی قابل رشک ناقدانہ صلاحیت، مطالعہ کی وسعت اور زبان کی واقفیت ظاہر ہوتی ہے۔ چکبست کا یہ ادبی معرکہ ایسا ہے جس نے بحیثیت تنقید نگار، اُردو زبان میں ان کا پایہ مسلم کر دیا۔ نسیم پر چکبست کے زیادہ توجہ دینے کی وجہ یہ تھی کہ وہ ہندو تھے اور چکبست بھی ہندو تھے۔ ہندو نقاد بھی شعرا تھے مثلاً برق اور سرور وغیرہ۔ دراصل چکبست کا خیال تھا کہ نسیم نے گلزار نسیم میں صرف رعایت لفظی نہیں برتی۔ عام خیال یہ تھا کہ مثنوی "سحر البیان" دلی اسکول کی نمائندگی کرتی ہے جس میں صاف ستھری زبان استعمال کی گئی ہے اور سادگی و بے تکلفی بھی کارفرما ہے اور لکھنؤ اسکول کا طرۂ امتیاز صرف تکلف و تصنع ہے۔ چکبست کا کہنا تھا "گلزار نسیم" صرف رعایت لفظی ہی کی حامل نہیں بلکہ نسیم کا کمال یہ ہے کہ انھوں نے رعایت لفظی کے ساتھ ساتھ معنی آفرینی اور باریک بینی و دقت نظری کے جوہر دکھائے ہیں مثلاً لکھنؤ اسکول کے ایک فرد امانت تھے۔ انکی رعایت لفظی ملاحظہ ہو:

قبر پہ میری لگایا نیم کا اس نے درخت ● بعد مرنے کے مری توقیر آدھی رہ گئی

اس میں سوائے "نیم" اور "آدھی" کی رعایت اور کیا ہے؟ یا مثلاً خلیل کا شعر ہے:

وہ شمع رو پتنگ اڑاتا ہے شاید آج ● کچھ پیچ پڑ گیا ہے جو آنے میں ڈھیل ہے

یہاں بجز پتنگ، پیچ اور ڈھیل کے کیا رکھا ہے؟ لیکن نسیم کی رعایت لفظی نکتہ آفرینی کا نمونہ ہے مثلاً نسیم کہتے ہیں:

مجنوں ہو گر تو فصد لیجے ● سایہ ہو تو دوڑ دھوپ کیجے

اس میں سایہ کی رعایت سے دھوپ ضرور ہے مگر معنی آفرینی کا کمال یہ ہے کہ لوگ جنوں اور پریوں کے سایہ کے جب قائل ہوتے ہیں تو تعویذ اور گنڈے کے لئے دوڑ دھوپ شروع کر دیتے ہیں۔ نسیم نے اس کمال کے ساتھ یہ رعایت رکھی کہ لفظی اور معنوی دونوں طرح رعایت کی رعایت ہے اور ایک دوسرے سے تعلق الگ بھی ہیں۔ اور ایک لفظ سے دوسرے کو تقویت مل رہی ہے اور سراسر تکلف کے باوجود مصرع میں بے تکلفی منتہا ہے۔ چکبست کا دعویٰ ہے کہ اس بندش اُردو کا کوئی شاعر ایسا نہیں جس کو اس روش کی ہوا بھی لگی ہو سوا نسیم کے۔ حقیقت یہ ہے کہ نسیم کے سوال میں چکبست نے انتقاد کا پورا پورا حق ادا کیا ہے اور کہیں سے بے جا طرفداری نہیں کی ہے اور یہی ایک سلیقہ شعار ذمہ دار نقاد کا فرض ہے اور یہ تسلیم کیا ہے کہ باوجود ہزاروں کمالات بھی نسیم آتش، ناسخ یا ذوق و غالب کے ہم پلہ نہیں تھے۔ لیکن نسیم صبا اور خلیل و وزیر کے مد مقابل ضرور تھے۔

چکبست کی ناقدانہ صلاحیت اور ایمانداری کا بہترین ثبوت ان کا وہ مضمون ہے جو سرشار پر انھوں نے لکھا ہے جس طرح کمالات سرشار پر سیر حاصل بحث کی ہے اور خوب خوب داد دی ہے۔ اسی طرح

"فسانۂ آزاد" کے معائب کا بھی تفصیلاً ذکر کیا ہے۔ ان کے نزدیک "فسانۂ آزاد" میں نظم وضبط اور سلسلہ و ترتیب کی بڑی کمی ہے۔ بعض کرداروں کا مثلاً آزاد، چال چلن متضاد پیش ہوا ہے۔ بعض کرداروں کے اعمال، مثلاً حسن آرا کے اعمال، فطرتِ انسانی کے خلاف ہیں۔ چکبست کا "فسانۂ آزاد" پر ایک اعتراض یہ بھی ہے کہ سرشار نے بعض جگہ بڑی زبردست ٹھوکر کھائی ہے مثلاً آزاد سے انھوں نے ایک قطعے کی تاریخ "ہیر تا تانچ کہلوائی ہے جس کے اعداد ۱۲۹۶ ہوتے ہیں اور اس کے بعد آزاد کا روم کی جنگ میں جانا بیان کیا ہے حالانکہ یہ لڑائی ۱۲۹۶ھ سے پہلے ختم ہو چکی تھی۔ پھر سرشار نے مصر کے ایلچی سے خوجی کو کہلوایا ہے "زخم کرسی کے" یہ خاص لکھنؤ کا محاورہ ہے۔ مصر کے لوگوں کو اس محاورہ کی خبر نہیں لہٰذا ایک مصری سے یہ محاورہ کہلوانا غلط ہے۔ سرشار کے ایسے کئی روئے بہت سے محاورے بھی چکبست کے نقطۂ نظر سے مستند نہیں۔

چکبست نے داغ دہلوی پر بھی بہت کچھ لکھا ہے اور جہاں انھوں نے داغ کو قدرتی شاعر اور خوش نصیب سخن گو تسلیم کیا ہے اور کہا ہے کہ ان کی شاعری معرکۃ الآرا شاعری، اور ان کا کلام میر و مرزا کے کمالات کا مجموعہ ہے اور جس حد تک قدردانی اور شہرت کا سوال ہے داغ کا ہم پلہ کوئی شاعر نہیں۔ ان کی زبان کی سلاست و روانی، ان کا انداز بیان اور ان کے کلام کا جذب و اثر بے مثل ہے۔ وہاں چکبست کا یہ بھی کہنا ہے کہ داغ کے نزدیک نفس پرستی کا نام عشق ہے۔ اسی لئے ان کا معشوق بازاری ہے۔ چکبست کا فیصلہ ہے کہ داغ حسن و عشق کے اعلیٰ مفہوم سے بے خبر تھے اور ان کی شاعری فی الجملہ حیاسوز شاعری ہے۔ ان کا کلام جذبات روحانی اور خیالات عالی سے خالی ہے۔ چکبست کے نزدیک داغ کا کلام دلوں میں چٹکی ضرور لیتا ہے مگر ایسی چٹکی نہیں جس سے روحانی سرور حاصل ہو بلکہ ایسی چٹکی کہ جنسی جذبات بھڑک اٹھیں۔ چکبست کے نزدیک داغ کا کلام استعارہ و تشبیہ کے حسن سے بھی مالا مال نہیں جو نازک خیالی اور شاعرانہ جوہر کی جان ہیں۔ نیز داغ کے کلام میں ایسے محاورے بہت ملیں گے جن کا نظم کرنا سخن سنجی کی شان کے خلاف ہے۔ چکبست نے داغ کے سلسلے میں بہت کچھ لکھا ہے اور بہت سے شعراء سے مقابلہ کیا ہے اور ان کا فرق دکھایا ہے۔ بہت سے اعتراضات کا چکبست نے جواب بھی دیا ہے کہ وہ غلط ہیں۔ غرض چکبست نے داغ پر جس انداز خاص سے ناقدانہ روشنی ڈالی ہے وہ اپنی جگہ پر مکمل اور شاید بے مثل بھی ہے۔

اردو شاعری پر بہت سے لوگوں نے اپنے اپنے خیالات ظاہر کئے ہیں مگر چکبست نے اس عنوان پر اپنی ناقدانہ صلاحیت کا جیسا مظاہرہ کیا ہے وہ اور کسی کے یہاں نہیں ملے گی۔

عام طور سے لوگوں کا خیال ہے کہ انگریزی قوم کے اثرات کے سبب لوگوں نے انگریزی زبان کو اپنایا تو ان میں یہ غلامانہ ذہنیت کارفرما ہو گئی کہ وہ اپنے سرمایۂ شعر و ادب کو انگریزی شاعری و ادب کے مقابلے میں ہیچ اور فروتر سمجھنے لگے اور جب انگریزی داں اپنے سرمایۂ شعر و ادب کا جائزہ لیتا ہے تو وہ اس خیال کا ضرور اظہار کرتا ہے کہ اس کے شعر و ادب کا پلہ انگریزی شعر و ادب سے پست ہے حالانکہ واقعتاً ایسا نہیں ہے۔ دراصل ہندوستانیوں کا مذاق بگڑ گیا ہے اور بالعموم ایسا کہنے والے وہی لوگ ہیں جنھوں نے شیکسپیئر اور ملٹن کو لغات اور فرہنگوں سے سمجھا ہے اور فرہنگوں سے شعر و ادب کے جسم تک تو رسائی ممکن ہے لیکن روح تک نہیں۔ بالکل اسی طرح جس طرح کوئی انگریز لاکھ اردو میں صلاحیت ہو وہ اردو کے شعروں کو پڑھ لے گا، سمجھ بھی لے گا مگر اس کے حسن بیان، طرز ادا اور زبان کی لطافت تک رسائی نہیں حاصل کر سکتا۔ اس بارے میں انھوں نے میر کا واقعہ لکھا ہے کہ جب ان سے کہا گیا کہ شعر سنائیے تو میر نے کہا کہ آپ میرا شعر سمجھ نہ سکیں گے۔ لوگوں نے کہا کہ ہم فردوسی و نظامی کا فارسی کلام سمجھ لیتے ہیں تو آپ کے اردو کلام میں کونسا جوہر ایسا ہے جس تک ہماری رسائی نہ ہو گی؟ میر نے کہا کہ فردوسی و نظامی کا کلام آپ فرہنگوں سے سمجھتے ہیں اور میرے کلام کی ابھی کوئی فرہنگ نہیں چھپی ہے لہٰذا آپ میرے کلام کے حسن تک نہیں پہنچ سکتے۔ بالکل اسی طرح ہماری انگریزی صلاحیت جس قدر بھی اعلیٰ ہو مگر ہم شیکسپیئر کو اس طرح ہرگز کبھی نہیں سمجھ سکتے۔ جس طرح کارلائل نے سمجھا تھا اور کہہ دیا تھا کہ ہم کو ہندوستان کی سلطنت سے زیادہ شیکسپیئر کا کلام عزیز ہے۔ یہ اس لئے کہ ہر زبان میں شاعرانہ نزاکتیں ایک خاص انداز رکھتی ہیں اور اس انداز تک صرف اس زبان والا ہی قرار واقعی پہنچ سکتا ہے۔ چکبست کے نزدیک شعر و ادب کی نزاکتوں تک پہنچنے کے لئے محض دماغی تربیت ہی کافی نہیں، بلکہ اس جذبِ لطیف کی پوری نشوونما ضروری ہے جس کا تعلق جذبات سے ہے۔ اور یہ چیز فرہنگوں سے نہیں حاصل ہو سکتی۔

چکبست کی اس رائے کے خلاف کچھ کہنا مشکل ہے اس لئے کہ وہ خود انگریزی ادب سے پورے طور پر واقف تھے۔ یہ نہیں کہا جا سکتا کہ انھوں نے جو کچھ لکھا ہے وہ بغیر ذمہ داری سے لکھا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ چکبست نے یہ محاذ اس لئے قائم کیا تھا کہ ہم ہندوستانیوں میں غلامانہ ذہنیت نے اس حد تک عمل دخل پا لیا ہے کہ ہمیں اپنی ہر چیز بے قیمت اور دوسروں کی ہر چیز بلند معلوم ہوتی ہے۔ حالانکہ ایسا نہیں ہے۔ غالباً یہی مرض حالی کو بھی لاحق تھا اور اندازہ ہے کہ "مقدمہ شعر و شاعری" سے متاثر ہو کر چکبست نے اس عنوان پر اپنی رائے پیش کی تھی۔ اور چونکہ حالی انگریزی زبان و ادب سے قطعاً بے بہرہ تھے اس لئے چکبست کی رائے حالی سے زیادہ وزن دار ہے۔

باقی (۱۲) پر

بقیہ

جمالیات کی مادی بنیاد اور اس کا مقصد

تو یہ ماننا پڑے گا کہ ہر جاندار فطرت میں زیادہ حسین بننے کا احساس پایا جاتا ہے۔

اگر ہم کائنات میں حسن کو "مقصد" نہ تصور کریں اور "نتیجہ" مان لیں تو ہم اس نتیجہ پر پہنچتے ہیں کہ زندگی کا پایا جانا خود حسن کا پایا جانا ہے۔ اور اس لیے حسن کی تخلیق کے لیے کوئی علیٰحدہ صنعت گری کی حاجت نہیں ہے۔ مثلاً شہد کی مکھیاں اپنی زندگی میں ممکن بغیر کسی سوچے سمجھے منصوبے اور تیاری اور شعور کے جو شہد کا چھتا بناتی ہیں وہ کتنا حسین، اور جیومیٹری کی صحت کا نمونہ ہے یہ سب ہی جانتے ہیں۔

پھر اگر فطرت کا حسن بغیر کسی سوچے سمجھے منصوبے کے تحت تخلیق پاتا ہے تو یہ بات بھی قابل غور ہے کہ شاعر، ادیب اور حسن کار کس حد تک صرف حسن کی تخلیق کی خاطر اپنے شاہکار سوچے سمجھے منصوبے کے تحت پیش کرتے ہیں۔ شاعر، ادیب اور حسن کار باوجود اپنے پورے خلوص کے صرف حسن کی تخلیق کے لیے وقف نہیں ہو سکتے۔ زندگی کی کشمکشیں جن میں ان کی روزمرہ زندگی ذہنی اور اخلاقی تصورات شریک ہیں انھیں جمالیات کے مطلق تصور سے دور رکھتی ہیں، اور اس طرح آرٹ کے لیے بھی وہی دشواری پیش آتی ہے جو فطرت کے لئے ہو سکتی ہے۔

چرنیشفسکی کہتا ہے کہ جس طرح فطرت کا حسن فطرت کی دوسری کشمکشوں کے نتیجے کے طور پر ظہور پذیر ہوتا ہے اور جس میں حسن مجروح بھی ہوتا ہے اسی طرح آرٹ کے شاہکار بھی ایسا ہی حسن تخلیق کرتے ہیں جو متضاد اشیاء کی کشمکش کو ظاہر کرتا ہے۔

چرنیشفسکی کے خیال کے مطابق ہیگل کا یہ اعتراض کہ فطرت کا حسن دیرپا نہیں ہے درست نہیں ہے۔ یہ صحیح ہے کہ پھول بہت جلد کھلا جاتا ہے مگر انسانی حسن زیادہ دیرپا ہوتا ہے اور پھر انسان کی حقیقی خواہشات اور تخیلی خواہشات میں بہت فرق ہے۔ چنانچہ انسان کی حقیقی حسن کو لازوال دیکھنے کی خواہش بھی ایک غیر حقیقی تخیلی خواہش ہے۔ زندگی کی تبدیلی کے ساتھ ساتھ نئے نئے تقاضے اور نئے حسن کے سامان بھی تیار ہوتے رہتے ہیں۔ آج کے دن کے حسن کے بعد کل کا دن آتا ہے اور اس کے ساتھ اس کا حسن بھی لگا ہوا ہے۔ اس طرح زندگی کے ساتھ اس کا حسن جاری رہتا ہے۔

پھر جمالیاتی احساس بھی اور احساسات کی طرح تھکنے اور آسودہ ہونے کی صلاحیت رکھتا ہے جس طرح مسرت کا مزا محدود ہوتا ہے اسی طرح مسرت کی بہتات بھی محدود ہوتی ہے اور عام آسودگی کی طرح جمالیاتی مسرت کا مزا بھی اپنی حدود رکھتا ہے۔ اس لئے جمالیاتی ذوق کی غیر آسودگی کا سوال پیدا نہیں ہوتا۔ اگر مان بھی لیا جائے کہ فطرت کا حسن دیرپا نہیں ہوتا تو یہی بات ادب اور آرٹ کے حسن پر بھی صادق آتی ہے۔ وہ بھی حادثوں اور نقصان کا شکار ہو سکتا ہے۔ یونانی عمارتیں شاہکار اور بہت کا قدیم نقاد پیرا اور مورتیاں استعداد زمانہ کا شکار ہو کر رہ گئیں پھر شاعری کے میدان میں زبانوں کا کیا بھروسہ۔ وہ بھی تو مٹتی رہتی ہیں۔ اسکے برخلاف فطرت پر کبھی ضعف کا حملہ نہیں ہوتا۔ فطرت پرانی اقدار کی جگہ نئی شاخیں نئی کونپل تیار کرتی ہیں ہمیشہ جوان رہتی ہے۔ حقیقی زندگی میں تو دراصل انسان ایسے کسی حسن کا متلاشی نہیں ہوتا جو مطلق طور پر مکمل ہو۔ ایسا تصور تو صرف ریاضی کے مجرد اصول میں ہی ممکن ہے۔ خود عملی ریاضیات میں بھی قریب ترین اعداد و شمار پر اکتفا کرنے کا اصول ملتا ہے۔

ہیگل کا یہ اعتراض کہ فطرت کی اشیاء میں مطلق حسن نہیں ملتا بھی غیر سائنٹفک تصور ہے۔ کیونکہ حقیقی دنیا میں ہم کوئی چیز ایسی نہیں پاتے جو از خود مطلق ہو۔ اس لئے ہمیں کچھ عملاً اندازہ بھی نہیں ہو سکتا کہ مطلق حسن کا اثر کیا ہوتا ہے پھر ہم جو انفرادیت کے حدود کو پار نہیں کر سکتے تو انفرادی حسن کے معیار سے کیونکر دامن بچا سکتے ہیں۔ خود یہ واقعہ کہ انفرادیت حسن کی بہترین علامت ہے اس تصور کو تقویت دیتا ہے کہ مطلقیت کا معیار حسن کے تصور کے منافی ہے۔

تخیل کا کام یقیناً شعوری دنیا میں کرشمے جگانے سے کم نہیں ہے۔ مگر ہیگل، وشر اور سارترے وغیرہ تصوری مفکروں نے تخیل کو بلاوجہ حسن کی خلاقی کا مقام دے دیا ہے۔ واقعہ تو یہ ہے کہ آرٹ میں حقیقت کی عکاسی اس خوبی سے ایک آرٹسٹ نہیں کر سکتا جتنا کہ وہ اپنے تخیل میں سوچ رکھتا ہے۔ اور پھر یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ یہ تخیل اس اصلی حسن سے بلند نہیں ہو سکتا جس سے حقیقی دنیا میں آرٹسٹ کو سابقہ پڑتا ہے تخیل زیادہ سے زیادہ مختلف تجربوں سے حاصل کیے گئے تاثرات کو یکجا کر کے کسی واحد شے کو کثرت میں بدل سکتا ہے یا اسکے حدود کو بڑھا چڑھا کر پیش کر سکتا ہے۔ مگر آرٹسٹ کسی شے کی خصوصیت کو اس کی اصلی شدت سے زیادہ بڑھی ہوئی حالت میں کبھی نہیں دیکھ سکتا اور نہ پیش کر سکتا ہے۔ ہم سورج کا اسکی اصلی جسامت سے بڑھی ہوئی حالت میں تصور لا سکتے ہیں مگر ہم اس کی اصلی چمک سے زیادہ تابناک ہونے کا کبھی تصور نہیں کر سکتے۔ ہم کبھی خواہ کچھ بھی اصطلاحات گھڑیں مگر ہمارا تخیل گرم برف کا تصور نہیں کر سکتا۔ ہم انسانوں کا عام انسانوں کے مقابلے میں زیادہ اونچے، موٹے وغیرہ ہونے کا گمان کر سکتے ہیں مگر ہم ان کا ایسے حسین ہونے کا گمان نہیں کر سکتے جس کی نظیر انسانی حسن میں نہ ملتی ہو۔ کیونکہ ایسا کام انسانی تخیل کے باہر ہے۔ آرٹسٹ زیادہ سے زیادہ عورت کی ایک ایسی تصویر بنا سکتا ہے جس میں اس کے پسند کی آئیڈیل آنکھ، ناک، جسم اور اعضاء اکٹھا ہوں مگر یہ سب بھی تو صرف تخیل ہی کی پیداوار نہیں ہیں، بلکہ فطرت کے حسن کا امتزاج ہے۔

(باقی)

تبصرے

ڈال ڈال پات پات ——— پروفیسر آل احمد سرور

مصنف : برہم ناتھ دت

ناشر : نگار بک ایجنسی۔ لکھنؤ

صفحات ۲۴۰ ۔ قیمت تین روپے

ڈال ڈال پات پات کے نام سے خطوط کا جو مجموعہ شائع ہوا ہے وہ آج کل کی نمائشی، مصنوعی اور گھٹی ہوئی فضا میں فطرت کا حسن بے پروا اور ٹھنڈی اور روح پرور ہوا کا ایک جھونکا ہے۔ ان خطوں کا لکھنے والا اس برگزیدہ نسل سے تعلق رکھتا ہے جو دلوں کو ملاتی تھی تہذیبوں کے سنگم پر نظر رکھتی تھی خلوص اور خدمت کو اپنا دستور العمل بناتی تھی۔ ان خطوں میں زندگی کے بیش قیمت تجربوں کا نچوڑ ہے۔ انسانیت کی اعلیٰ قدروں کی ترجمانی ہے۔ ادب کے جواہر پاروں کی آب و تاب ہے، یہاں مذاہب کی تعلیم، فلسفے کی گہرائی، شعر و ادب کی رعنائی سبھی کچھ ملے گی۔ ناصر نے زندگی میں بہت سے دکھ جھیلے مگر دکھوں کے سمندر سے، انھوں نے مسرت اور بصیرت کا امرت بلو ہی لیا۔ ان کے خطوں میں واعظانہ لہجہ نہیں دوستانہ انداز ہے۔ وہ ناصح مشفق نہیں ہمدرد اور ساتھی ہیں۔ ہماری مشترک تہذیب کی جتنی اچھی قدریں ہیں وہ سب ان خطوں میں ملتی ہیں۔ یہ مجموعہ پڑھ کر مجھے میر کا ایک مشہور شعر بے ساختہ یاد آیا۔ ایک لفظ بدل کر لکھے دیتا ہوں تاکہ اُسے ناصر صاحب کے لئے استعمال کر سکوں:۔

مت سہل انھیں جانو پھرتا ہے فلک برسوں
تب خاک کے پردے سے انسان نکلتے ہیں

خدا کرے نیا ہندوستان پرانے ہندوستان کی اس انسانیت کو باقی رکھ سکے۔

ادبی مقالات ——— خلیل الرحمن اعظمی

مصنف : بشیر علی صدیقی

ناشر : رسالہ رہنمائے تعلیم۔ دہلی

قیمت : ڈیڑھ روپیہ

زیر نظر کتاب بشیر علی صدیقی صاحب کے ان مضامین کا مجموعہ ہے جو ۱۹۴۳ء اور ۱۹۴۶ء کے درمیان لکھے گئے۔ یہ مضامین یا تو مصنف نے زمانۂ طالب علمی میں لکھے یا امتحان سے فارغ ہونے کے فوراً بعد اس لئے انھیں پڑھتے ہوئے مصنف کے اپنے تنقیدی شعور یا زاویۂ نظر کا اندازہ نہیں ہوتا بلکہ مروجہ معلومات اور آرا کا خلاصہ کر دینے یا انھیں اپنے انداز میں بیان کر دینے کا رجحان نمایاں ہے۔ غالباً اسی وجہ سے یہ کتاب ادبی حلقوں کے بجائے طلبہ کے گروہ میں پسند کی گئی۔ زیر تبصرہ کتاب اس کا دوسرا ایڈیشن ہے اور اس میں شک نہیں کہ نصابی ضرورتوں کا لحاظ کرتے ہوئے یہ کتاب اپنی جگہ پر اب بھی کار آمد ہے۔ حالی کی شاعری، اُردو مزاح نگاری کی مختصر تاریخ، اُردو کی ابتدا کیونکر ہوئی، اقبال کی شاعری کے تین دور، سبک اور سودا کی شاعری پر ایک اجمالی نظر اس مجموعے کے اہم مقالات ہیں۔

"شاعر" خاص نمبر ۱۹۶۱ء ——— شہریار

ضخامت : ۲۰۲ صفحات۔ قیمت ایک روپیہ پچھتر نئے پیسے

ملنے کا پتہ : مکتبہ قصر الادب پوسٹ بکس نمبر ۴۵۲۶ بمبئی ۸

ہندوستان سے نکلنے والے ماہناموں میں "شاعر" کو اس اعتبار سے منفرد حیثیت کا مالک کہا جا سکتا ہے کہ کسی خاص رجحان یا مکتب کے لکھنے والوں کی پبلسٹی اور تبلیغ کیلئے مخصوص نہیں ہے بلکہ مختلف رجحانات اور مکاتیب فکر کی نمائندگی کرتا ہے۔ زیر تبصرہ خاص نمبر کا تنوع اور رنگا رنگی اس کا ثبوت ہے۔ اس خاص نمبر میں آٹھ مضمون، ستر نظمیں، تیرہ افسانے اور ستائیس غزلیں شامل ہیں جن میں سردار جعفری اور عمیق حنفی کے مضامین (اسلوب احمد انصاری کا مضمون مطبوعہ ہے) جمیل مظہری، سلام مچھلی شہری، شاذ تمکنت، شہاب جعفری اور زبیر رضوی کی نظمیں، سہیل عظیم آبادی، جیلانی بانو اور رام لعل کے افسانے، فراق گورکھپوری، میکش اکبر آبادی، کیفی اعظمی، خلیل الرحمن اعظمی اور محمد علوی کی غزلیں بطور خاص پڑھنے کے لائق ہیں ✦



پبلشر نذیر حسن پرنٹر ضمیر الدین قریشی نے مسلم ایجوکیشنل پریس علی گڑھ میں چھپوا کر مرکزی انجمن سے شائع کیا